© rasailojaraid.com

میرزا ادیب (قسط اوّل)

آغا شورش کاشمیریؒ

سردی کا آغاز ہو چکا تھا۔نومبر کے ابتدائی دنوں میں سے کوئی دن تھا اور وقت صبح کا تھا۔ہوا خوشگوار تھی۔اس خوشگوار ہوا کے جھونکے جب چہرے کو چھوتے تھے تو بڑا لطف آتا تھا۔یہ وہ زمانہ تھا کہ جب میں بحیثیت ایک نظم گو شاعر کے کافی حد تک مشہور ہو چکا تھا۔اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں زیر تعلیم تھا تو ذکر آغازِ سرما کی ایک صبح کا تھا۔میں گھر سے نکل کر بھاٹی دروازے تک پہنچا۔دروازے میں سے نکلا تو سرکلر روڈ پر آ کر انارکلی کی طرف روانہ ہو گیا گنپت روڈ پر چند منٹ ہی چلا تھا کہ ایک سانولا دراز قد لڑکا لپک کر میرے پاس آ گیا۔اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک پیالہ تھا جس میں زیادہ سے زیادہ آدھ پاؤ دہی ہو گی۔

''آؤ میرزا! بیٹھو دہی اندر رکھ کر ابھی آتا ہوں''ہم دونوں دائیں جانب ایک لمبی گلی پر چلنے لگے پھر کچھ دور پہنچ کر ایک اور گلی میں داخل ہو گئے یہ گلی بھی دائیں جانب تھی۔وہ سانولے رنگ کا دراز قد لڑکا ایک پھاٹک کے اندر داخل ہو گیا اور ایک منٹ میں غائب ہو گیا۔میں پھاٹک کے اندر دالان میں بچھی ہوئی ایک جھلنگا چار پائی پر بیٹھ کر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔اس چار پائی کے بان کا کافی حصہ نیچے لٹک کر زمین کو چھو رہا تھا۔ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ وہ پھٹے پرانے چپل زور زور سے زمین پر پٹختا ہوا وارد ہو گیا۔

''چلو ناشتہ لے آئیں''اور ہم ناشتہ لینے کے لئے چل پڑے۔راستے میں وہ بتاتا رہا کہ اس نے ساری الف لیلہ پڑھ لی ہے۔استاد ذوق کا دیوان پڑھنا شروع کر دیا ہے پھر اس نے پوچھا میرزا تم نے کونسی تازہ نظم لکھی ہے۔میں نے کہا کہ ایک انگریزی نظم Daffodils کا ترجمہ کیا ہے' کہنے لگا جمعرات کو میٹنگ ہو گی اس میں پڑھنا۔ہم اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے ہسپتال روڈ پر پہنچ گئے۔ایک روڈ کے متصل ایک چھوٹی سی دکان کے اندر ایک بوڑھا آدمی جس کی سفید داڑھی سے پسینے کے قطرے مسلسل گر رہے تھے۔بڑی مستعدی سے تنور سے کلچے نکال نکال کر گاہکوں کو دے رہا تھا۔وہ تنہا سب کام انجام دیتا تھا۔میدے کے پیڑے بھی بناتا تھا پیڑوں کو کلچوں کی شکل بھی دیتا تھا اور انہیں جلدی جلدی گدی پر رکھ کر' تنور کے اندر لگاتا بھی تھا اور سیخوں سے ایک ایک دو دو کر کے انہیں نکالتا بھی جاتا تھا۔ساتھ ہی گاہکوں سے پیسے وصول کر کے خود ہی ان کے رومال پھیلا کر کلچوں کی مطلوبہ تعداد بھی دیتا جاتا تھا۔ایک جانب مٹی کا پیالہ بھی پڑا تھا جس میں وہ گاہکوں سے پیسے وصول کر کے اور ان پر ایک نظر ڈال کر رکھتا جاتا تھا۔یہ سارے کے سارے کام وہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر کر رہا تھا۔وہ ان سب کاموں کا عادی تھا اور ان کی انجام دہی میں اسے کسی قسم کی دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑتا تھا۔اس نے ہم دونوں کو آتے دیکھا تو مسکرا کر معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔آ گئے ہو مفت خورو! اور ہم دونوں مفت خورے' دکان کے سامنے کھڑے ہو گئے' ہمیں دیکھتے ہی گاہکوں میں اضطراب کی رو دوڑ گئی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بابا ان سب کو نظر انداز کر کے سب سے پہلے مفت خوروں کو کلچے دے گا اور یہ اس کا روز کا معمول ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بوڑھے نے چار کلچے الگ کر دیئے۔ دو میرے دوست نے اٹھا لئے اور دو میں نے۔ میں نے اپنے دوست کی طرف دیکھ کر آنکھ کے اشارے سے کہا ’’چلو اب کھڑے کیوں ہو‘‘ اس نے دایاں ہاتھ فضا میں لہرا کر رک جانے کے لئے کہا۔ بوڑھا اپنے کام میں مصروف رہا۔ گاہک آتے رہے اور جاتے رہے اور ہم دونوں کھڑے رہے۔

’’کریمے! اب کیا ہے؟ بوڑھے نے میرے دوست کو مخاطب کر کے کہا۔

’’نانا! پیسے؟‘‘

’’روز پیسے……روز پیسے؟ بڑے فیلسوف ہو گئے ہو۔‘‘

’’نانا شکر کے لئے پیسے دو‘‘ اور نانا جان نے ایک آنہ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میرے دوست کی باچھیں کھل گئیں۔ جب جانے لگے تو پیچھے سے آواز آئی:

’’کریمے پتر!‘‘ اب کے بوڑھے کی آواز میں بڑی شفقت تھی۔ ہم دونوں واپس جانے لگے۔ بوڑھے نے میرے دوست کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

’’پتر! بخار اتر گیا ہے؟‘‘

’’اتر گیا ہے‘‘

وہ شفقت انگیز ہاتھ میرے دوست سے ہٹ کر میرے سر پر پھرنے لگا۔

’’لے پتر! تو بھی ایک آنہ‘‘ اور ایک آنہ مجھے بھی مل گیا۔

گاہکوں کا ہجوم بڑھ گیا تھا۔ بوڑھا ان کی طرف متوجہ ہو گیا اور ہم واپس جانے لگے ابھی ایک روڈ پر ہی پہنچے تھے کہ میرے دوست نے ایک کلچہ توڑ کھا بائیں ہاتھ میں اور دوسرے کلچے کو دوہرا کر کے بار بار اسے دانتوں کے نیچے لا کر سانس لئے بغیر نگلنے لگا۔ راہگیر اسے حیرت سے دیکھنے لگے کہ یہ کیسا آدمی ہے…… بازار میں وحشیوں کی طرح کلچہ کھا رہا ہے مگر میرے دوست کو ان لوگوں کی طعن آمیز نظروں کی مطلقاً پروا نہیں تھی‘ وہ اس انداز میں کلچہ کھاتا رہا اور جب پورے کا پورا کلچہ نگل گیا تو بائیں ہاتھ والا کلچہ بھی اس کے دائیں ہاتھ میں آ گیا اور اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنے لگا۔ جب تک ہم گنپت روڈ پر پہنچے دونوں کلچے اس کے پیٹ میں جا چکے تھے اور مجھے یہ اذیت ناک احساس پریشان کرنے لگا کہ اب میرے کلچوں کی خیر نہیں۔ گھر پہنچتے ہی وہ مجھ سے میرا ایک کلچہ لے لے گا اور معذرت بھی نہیں کرے گا۔ ہم اس کے مکان کے دالان میں اسی جھلنگا چار پائی پر بیٹھ گئے جہاں کچھ دیر پہلے میں نے بیٹھ کر اس کا انتظار کیا تھا۔ وہ اندر چلا گیا اور دہی والا پیالہ لے آیا:

’’یار! تُو تو اپنے دونوں کلچے کھا چکا ہے‘‘ میں نے احتجاجاً کہا۔

’’کھا چکا ہوں پھر کیا ہے؟‘‘

’’اب دہی کے ساتھ کیا کھاؤ گے؟‘‘

’’کلچے اور کیا؟‘‘

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نے سوچ لیا میرے دونوں کلچوں کی خیر نہیں کیونکہ میرے دوست نے کلچہ نہیں کلچے کہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ بے تحاشا ہنسنے لگا اور پھر یوں ہوا کہ اس نے اپنے میلے کچیلے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب اسے نکالا تو اس کی انگلیاں ایک کلچے کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھیں۔ یہ کلچہ اس نے چارپائی کے ایک طرف رکھ دیا جیب میں پھر ہاتھ ڈالا تو ایک اور کلچہ نکال لیا۔

''یار کریم! یہ کہاں سے آ گئے۔ تم نے تو اپنے دونوں کلچے کھا لئے تھے' نہیں ہڑپ کر لئے تھے۔''

''دیکھو تو میرزا''

''دیکھ تو رہا ہوں...... یہ تمہارے پیٹ سے نکل کر دوبارہ جیب میں کیسے پہنچ گئے؟''

''پیٹ سے نہیں دکان سے نکل کر آئے تھے!''

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''نانا پیار کر رہا تھا تو میں نے جلدی سے یہ کلچے جیب میں ٹھونس لئے تھے۔''

''یار سچ؟''

''تو اور کہاں سے آ گئے؟''

وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور اس کے منہ سے تھوک نکل کر میری پیشانی پر آ لگی۔

''یار میرزا! دیکھا میں کتنا استاد آدمی ہوں۔''

میرا دوست سچ مچ استاد آدمی تھا...... مگر اس وقت تک اس کی استادی ایسی ہی بچگانہ حرکتوں تک محدود تھی۔ اس کی حقیقی استادی کا زمانہ بہت دور تھا۔ ابھی اس کی طفلانہ استادی اور فرزانہ استادی میں ہزاروں دنوں کی روشنیاں اور ہزاروں راتوں کے اندھیارے حائل تھے۔ ان روشنیوں اور اندھیروں کو عبور کر کے اسے اپنی حقیقی استادی کے مقام بلند پر پہنچنا تھا۔ لیکن ابھی مجھے اس کی حقیقی استادی سے کچھ تعلق نہیں۔ ابھی تو مجھے اس کی انہی حرکتوں' سے تعلق ہے جن سے اس کی نوجوانی عبارت تھی۔ تو آغاز سرما کی اس صبح کو میں اور وہ گنپت روڈ کی ایک گلی کے اندر' ایک بڑے سے پھاٹک کے پاس جھلنگا چارپائی پر کلچے دہی میں ڈبو ڈبو کر کھا رہے تھے۔

''کیوں میرزا آیا مزا؟۔ دو پیسے کی شکر ڈالی ہے۔''

''بہت مزے دار ہے'' اور میں نے واقعی سچی بات کہی تھی۔ وہ شکر آلود دہی بڑی میٹھی تھی اور وہ نرم نرم کلچے عجیب مزہ دے رہے تھے۔ میرا دوست...... وہ لمبا' سانولے رنگ کا نوجوان...... ماں باپ نے اس کا نام عبدالکریم رکھا تھا اور جس کاشمیری خاندان کا وہ فرد تھا وہ امرتسر رہتا تھا۔ یہ خاندان امرتسر سے نکل کر لاہور میں آ بسا۔ لاہور آنے کے بعد اس خاندان نے کہاں رہائش اختیار کی۔ یہ میں نہیں جانتا۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ میں نے عبدالکریم کو جب سے دیکھا تھا وہ گنپت روڈ کی اس چھوٹی سی گلی کے اندر' ایک بہت معمولی مکان ہی سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہی دنوں جب اسے شاعری کا شوق چڑھ آیا تو اس کے لئے تخلص کا انتخاب ہم سب کے لئے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ ہم جو اس کے دوست تھے ایک روز پھاٹک کے اندر چارپائی پر بیٹھ کر اس نہایت اہم مسئلے پر غور کرنے لگے۔ اس وقت وہاں میں تھا۔ علاؤالدین اختر تھا، حکیم بدر محی الدین تھا، چونی لال کاوش تھا اور یزدانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جالندھری تھا۔

کسی نے کہا عبدالکریم کریم ، دوسرا بولا ،نہیں عبدالکریم کرم ۔فضول ہے ۔شاید حکیم بدرمحی الدین نے اس تجویز کورد کردیا۔ چونی لال کاوش نے کھڑے ہوکر کہا۔سنو، دوستو! غور سے سنو۔آج ہمارے دوست کی رسمِ ختنہ۔نہ نہ نہ میری توبہ ''رسمِ تخلص برداری'' ادا ہورہی ہے۔ چونکہ عبدالکریم کو ہم سب سے اُلفت ہے اور ہمیں بھی اس ''لم سلمّے'' سے اُلفت ہے۔اس لئے اس کا تخلص اُلفت ہونا چاہیے۔''

یہ الفاظ سنتے ہی عبدالکریم چارپائی پر سے اُٹھ کر فرش پر ناچنے لگا۔

''عبدالکریم اُلفت مبارک ہو''

''عبدالکریم میری طرف سے مبارکباد'' میں نے بھاگ کر اسے گلے سے لگالیا۔ اور عبدالکریم یکے بعد دیگرے مبارکبادیں قبول کرنے لگا۔اس کا رنگ فرطِ مسرّت سے سُرخ ہوگیا تھا۔

''اور میں اب تجویز کرتا ہوں کہ عبدالکریم اُلفت اسی خوشی میں ہم سب کا منہ میٹھا کرائے۔''

یہ تجویز علاؤالدین اختر کی تھی اور اسے سنتے ہی عبدالکریم جو بے تحاشا ناچ رہا تھا، جلدی سے چارپائی کے اوپر بیٹھ گیا۔

''ارے بالما! تُو جھاگ کی طرح بیٹھ گیا ہے!''

''یار میری جیب میں تو ایک دمڑی بھی نہیں۔''

''پھر یہ تخلص واپس کردو......ورنہ......''

علاؤالدین اختر نے راگ الاپا۔''بالما موئے بے دردی...... جیب میں نہیں ایک دمڑی۔''

''ہائے ہائے ہائے ہائے'' سب کے سب سینہ کوبی کرنے لگے۔

عبدالکریم اُلفت کو معلوم ہوگیا کہ اگر اس نے کھسک جانے میں جلدی نہ کی تو زبانوں کی تیزی و تندی بانہوں میں آجائے گی اور وہ یہ کہہ کر اندر جانے لگا۔''لاتا ہوں۔ بھائی! لاتا ہوں۔''

آدھ گھنٹہ گزر گیا...... پورا گھنٹہ بیت گیا اور عبدالکریم اُلفت کا کوئی پتا نہیں۔اسے آوازیں دی جارہی ہیں' چیلنج دیئے جارہے ہیں مگر وہ تو نہ جانے کہاں اور کس طرح غائب ہوگیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ اور انتظار کرنے کے بعد ہم بےنیلِ مرام اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔حکیم بدرمحی الدین یاروں کا یار تھا۔اس کا گھر ہمارے لئے تفریح گاہ بھی تھا، جائے ملاقات بھی، جائے پناہ بھی۔ چوک متی کے علاقے میں کتابوں کی ایک بہت وسیع اور پرانی دکان' جے ایس سنت سنگھ کے عقب میں، ایک تنگ وتاریک گلی کے اندر حکیم بدرمحی الدین کا مکان واقع تھا۔حکیم صاحب اس مکان میں تنہا رہتے تھے۔شادی ہوئی نہیں تھی۔اس مکان میں ان کے والد کے علاوہ اور کبھی کوئی خاندانی فرد نہیں دیکھا گیا تھا۔ہم لوگ، وہاں جا کر آپس میں ملتے تھے۔مزے لے لے کر باتیں کرتے تھے۔ایک دوسرے کو اپنے لکھے ہوئے شعر سناتے تھے اور سب سے زیادہ یہ کہ تاش کھیلتے تھے۔یہ گھر ہمارے لئے ایک قسم کا تاش گھر' بن گیا تھا۔ہم یہاں بڑے شوق سے تاش کھیلتے رہتے تھے اور اس کھیل میں چار چار پانچ پانچ گھنٹے گزار دیتے تھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۔عبدالکریم اُلفت بھی وہاں پہنچ جاتا تھا مگر اسے تاش سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم اسے کھیل میں شریک کرنے سے بالعموم احتراز کرتے تھے مگر جب چار ساتھی موجود نہیں ہوتے تھے تو اسے مجبوراً شامل کرنا پڑتا تھا۔ اس سے یہ وعدے ضرور لیتے تھے کہ سنجیدگی سے کھیلے گا اور خرمستی نہیں دکھائے گا۔ وہ وعدہ کر لیتا تاش کھیلنے میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گا۔ دو تین ''بازیاں'' تو پرامن فضا میں ہو جاتی تھیں لیکن اس کے بعد عبدالکریم اُلفت کے اندر سوئی ہوئی خرمستی' اچانک جاگ اُٹھتی تھی، پہلے تو وہ مولانا ظفر علی خاں یا کسی اور شاعر کے شعر گنگنانے لگتا تھا۔ پھر کہنیوں کے سہارے بیٹھ جاتا تھا دوسرے کے پتے دیکھنے کی کوشش کرنے لگتا تھا۔ معاملہ یہیں تک محدود نہیں رہتا تھا۔ پتا فرش پر اس زور سے پھینکتا تھا کہ وہ کہیں سے کہیں جا پڑتا تھا۔

ہم چند منٹ تو اس کی حرکتیں برداشت کرتے رہتے، اُسے سمجھاتے بھی رہتے، وعدہ بھی یاد دلاتے رہتے مگر جب صورتِ حال اس طرح بگڑ جاتی کہ وہ لیٹ کر کھیلنے لگتا تو ماحول ناخوشگوار ہو جاتا۔ ہم اسے پا بدست دِگرے، دست بدست دگرے، کی صورت میں کمرے سے باہر نکال دیتے۔ ایک روز ہم بڑے انہاک سے تاش کھیل رہے تھے۔ عبدالکریم میرا ساتھی بن کر کھیل رہا تھا اور اس کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گا...... مگر صاحب عبدالکریم اُلفت شروع سے آخر تک سنجیدہ رہے، یہ ممکن نہیں تھا۔ پہلے تو اس نے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر شعر گائے...... پھر لیٹ گیا اور لگا کیکڑے کی طرح اپنی لمبی لمبی ٹانگیں مارنے۔

حکیم بدر محی الدین چیخے! ''کریم! باز آتے ہو کہ نہیں۔''

عبدالکریم یہ فقرہ ''کریم باز آتے ہو کہ نہیں' 'استادانہ رنگ میں گانے لگا اور لگا تانیں مارنے۔

چونی لال بولا ''یہ نہیں باز آئے گا۔ کرتب دکھاؤ۔''

کرتب ہمارے ہاں ایک خاص اصطلاح کے طور پر رائج تھا اور اس کے ساتھ کئی قسم کے معنی وابستہ ہو گئے تھے۔ مثلاً ہم بیٹھے ہوئے ہیں کہ اتنے میں کوئی غیر پسندیدہ شخص آ جاتا ہے۔ ایسے میں مَیں یزدانی جالندھری سے کہتا۔ ''یارو! کرتب دکھاؤ''

اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی ایسی حرکت یا کام کرو کہ نو وارد چلا جائے۔ آسان تجویز یہ ہوتی تھی کہ ہم میں سے ایک شخص گھبرا کر کہہ اُٹھتا: ''ارے غضب ہو گیا...... چار بج گئے ہیں اور ہمیں ساڑھے تین بجے فلاں جگہ جانا تھا۔''

یہ بات سنتے ہی بظاہر سب کے سب گھبرا جاتے اور وہ غیر پسندیدہ شخص سچ مچ گھبرا کر رخصت ہو جاتا۔ عبدالکریم اُلفت کے معاملے میں کرتب کا مطلب یہ تھا کہ اسے زبردستی ہاتھ پاؤں پکڑ کر کمرے سے نکال دو۔ اس وقت ہم نے یہ کرتب کیونکر دکھایا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا...... یہ میں ابھی عرض کرتا ہوں مگر پہلے حکیم بدر محی الدین کے مکان کے اس حصے کا نقشہ سامنے لائیے جہاں ہم بیٹھا کرتے تھے۔ یہ حصہ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ سیڑھیوں کے اوپر ایک کمرہ تھا...... اور اس کے وسط میں دو تین سیڑھیاں تھیں اور سیڑھیوں کے ساتھ ایک کمرہ تھا اس کمرے کا اپنا دروازہ تھا اور پہلے کمرے سے نسبتاً بڑا تھا۔ اس کے فرش پر دری بچھی رہتی تھی حکیم بدر محی الدین اس کمرے کی خاص طور صفائی کرتا تھا اور ہمیں بھی ہدایت تھی کہ جب یہاں آؤ اپنے جوتے نچلے کمرے میں اتار کر آؤ۔ تو اس دن کرتب شروع ہونے والا تھا اور حسبِ معمول معرکے کا کرتب تھا۔ عبدالکریم کو معلوم تھا کہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتب کاتعلق اس کی ذات سے ہے اور اسے ایک بھرپور حملے کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

عبدالکریم دیوار کے ساتھ کھڑا ہوگیا اور اس نے اپنی آستینیں چڑھالیں۔ادھر سے چونی لال کاوش بھی اکھاڑے میں اترنے کی تیاریاں کرنے لگا۔وہ ہم میں سب سے زیادہ طاقتور تھا۔میں اور یزدانی جالندھری تو بس ''ریلو کٹے'' تھے۔البتہ حکیم بدر محی الدین بڑا فعال آدمی تھا۔

کاوش نے عبدالکریم کی دونوں ٹانگوں کو پکڑ لیا۔حکیم بدرمحی الدین نے عبدالکریم کی لمبی لمبی بانہوں کو قابو میں لانے کی سعیٔ بسیار کی اور ہم دونوں نحیف ونزار آدمی یعنی میں اور یزدانی بس شور مچاتے رہے اور اپنے دونوں پہلوانوں کی ہمت بڑھاتے رہے۔بڑے معرکے کا رن پڑا اور ہمارے پہلوانوں نے عبدالکریم کو اوپر کے کمرے سے نکال کر نچلے کمرے میں دھکیل کر جلدی سے دروازہ بند کردیا۔اب دروازے پر مکوں اور لاتوں کی بارش ہونے لگی۔چندمنٹ بعد یہ بارش تھم گئی۔ہمارا حریف شکست کھا کر مضمحل ہو چکا تھا۔

''اب چھوڑ دو یار'' کاوش کو اپنے شکست خوردہ حریف پر رحم آ گیا۔حکیم بدرمحی الدین نے دروازے پر پہنچ کر کہا

''خرمستی کرو گے؟''

باہر سے آواز آئی ''نہیں''

''توبہ کرو'' کاوش نے ارشاد فرمایا۔

''توبہ''

''کس کی توبہ؟''

''سب کی توبہ''

''نہیں کہو میری توبہ''

''میری توبہ''

کئی منٹ کے بعد ضدی حریف رام ہوگیا اور اس نے توبہ کر کے یقین دلایا کہ آئندہ خرمستی نہیں کرے گا۔دروازہ کھول دیا گیا اور عبدالکریم جو پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اوپر کے کمرے میں آتے ہی دری پر لیٹ گیا۔ہم تاش کھیلنے لگے اور وقفے وقفے بعد اس پر آوازے بھی کستے جاتے تھے مثلاً ''مر گئے ہو کہ زندہ ہو؟''

''دودھ جلیبیاں کھاؤ گے؟''

عبدالکریم چپ چاپ لیٹا رہا......ہم پورے انہاک سے تاش کھیلنے لگے۔اپنے گہرے انہاک میں مَیں نے دیکھا کہ دروازے پر ایک سایہ سا نظر آیا اور پل بھر میں غائب ہوگیا۔

''خس کم جہاں پاک'' میں نے کہا

(جاری ہے)

© rasailojaraid.com